پروفیسر ڈاکٹر رؤف پاریکھ، کراچی

صحتِ زباں: چند الفاظ و مرکبات کا املا اور تلفظ

پزیر نہیں پذیر

عجیب بات ہے کہ جن الفاظ کا برسوں بلکہ صدیوں سے درست املا لکھا جا رہا تھا اب ان کے املا میں غیر ضروری اور بلا جواز تبدیلیاں کر کے انھیں مسخ کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ایسے ہی الفاظ میں لفظ ''پذیر'' بھی شامل ہے۔ خدا جانے کیوں اب اس کا املا ''ذ'' (ذال) کے ساتھ کرنے کی بجائے ''ز'' (زے) سے کیا جا رہا ہے یعنی اب اسے ''پذیر'' کی بجائے ''پزیر'' لکھا جا رہا ہے۔ اسی طرح ''پذیرائی'' کا بھی غلط املا رائج کرنے کی غیر ضروری کوشش کی جا رہی ہے اور اسے ''پزیرائی'' لکھا جا رہا ہے، لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

پذیر دراصل فارسی کے مصدر ''پذیرفتن'' سے ہے۔ پذیرفتن کے معنی ہیں: قبول کرنا۔ پذیر کا لاحقہ عام طور پر ''قبول کرنے والا'' کے معنوں میں آتا ہے، مثلاً تربیت پذیر، سکونت پذیر، ترقی پذیر، زوال پذیر۔ رشید حسن خان کے بقول، پذیر میں ذال ہے اور اس کے مشتقات میں بھی ذال آئے گی، مثلاً پذیرائی، دل پذیر، اثر پذیر، خلل پذیر[1]۔

پذیر کو ذال کی بجائے زے سے یعنی ''پزیر'' لکھنے کی بدعت کے پیچھے اگر کوئی علمی بحث ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ ذال تو عربی کا حرفِ تہجی ہے اور پذیر فارسی کا لفظ ہے لہٰذا اس میں ذال کی بجائے زے لکھنی چاہیے۔ بعض لوگوں کے خیال میں فارسی میں ذال کا وجود نہیں ہے اور فارسی الفاظ میں ذال نہیں آسکتی اور پذیر چونکہ فارسی کا لفظ ہے اس لیے ان کے خیال میں پزیر (زے سے) درست ہے۔

لیکن یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ اس موضوع پر بہت بحثیں ہو چکی ہیں اور ان کو دہرانے کی نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش، مختصراً یہ کہ زبان و ادب اور لسانیات کے علما نے لکھا ہے کہ فارسی میں ذال کا وجود ہے اور پہلے بھی رہا ہے۔ اس بحث میں مرزا غالب کا بھی حصہ ہے اور انھوں نے اپنے ایک خط میں یہ خیال ظاہر کیا کہ فارسی میں ذال کا وجود نہیں ہے حالانکہ یہ بات صریحاً غلط ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی جیسے ماہر زبان و لسانیات (جو کئی زبانوں کے عالم تھے) نے لکھا ہے کہ فارسی میں ذال وجود رکھتی ہے اور اس ضمن میں مرزا غالب کا خیال بالکل غلط ہے کہ فارسی میں ذال نہیں ہے لہٰذا پذیر میں ذال لکھنا غلط ہے[2]۔

سید قدرت نقوی نے بھی اپنے ایک مقالے میں یہ ثابت کیا ہے کہ قدیم فارسی میں بھی ذال کا وجود تھا اور ''ذال'' کے تلفظ پر بھی انھوں نے بحث کی ہے[3]۔ وحید الدین سلیم نے بھی اپنی کتاب ''وضع اصطلاحات'' میں پذیر اور اس کے مرکبات میں ذال لکھی ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر غلام مصطفی خاں، قاضی عبدالودود، پروفیسر نذیر احمد اور ڈاکٹر فرمان فتح

drraufparekh@yahoo.com

پوری جیسے اہل علم کی اٹھائی گئی بحثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ان الفاظ کا املا ''زے'' سے کرنا یعنی انھیں پزیر اور پزیرائی لکھنا قطعاً غلط ہے اور ان الفاظ کا صحیح املا ذال کے ساتھ یعنی پذیر اور پذیرائی ہے۔ لیکن چند عاقبت نا اندیش اور برخود غلط لوگ ان الفاظ کا غلط املا اخبارات میں رائج کر رہے ہیں۔ ان سے پوچھا جانا چاہیے کہ اردو، عربی اور فارسی کے ان جید ماہرین کے

> اب تو اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اضافت لگانے یا نہ لگانے کے معاملے میں الجھن کا شکار نظر آتے ہیں۔ اور اس افراط و تفریط کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں بھی اضافت لگائی جا رہی ہے جہاں اضافت کی کوئی تک ہی نہیں بنتی۔ ایسی ہی ایک ترکیب ''پس منظر'' ہے، جس میں اضافت نہیں ہے

دلائل کے جواب میں آپ کے پاس کیا دلائل ہیں۔ لیکن وہ شاید ان مباحث سے واقف ہی نہیں ہیں، اس موضوع پر کچھ پڑھنا تو کی دور کی بات ہے۔

اگر ان نادانوں کی یہ روش برقرار رہی تو خطرہ ہے کہ آگے چل کر عربی الفاظ سے بھی ذال کو خارج کر دیا جائے گا اور کچھ لوگوں نے تو لذیذ اور تعویذ کو ذال کی بجائے زے کے ساتھ یعنی غلط طور پر لزیز اور تعویز لکھنا بھی شروع کر دیا ہے۔ دراصل ہندستان میں ایک زمانے میں یہ تحریک چلی تھی کہ اردو سے عربی حروف ''ض''، ''ذ'' اور ''ظ'' وغیرہ کو خارج کر دیا جائے اور ان سب کی جگہ ''ز'' لکھی جائے۔ اس کے علاوہ ''ع'' کی جگہ ''الف'' اور ''ح'' کی جگہ ''ہ'' لکھی جائے۔ اس تحریک کے ایک بڑے حامی نواب محسن الملک کے بھتیجے ڈاکٹر جعفر حسن تھے اور وہ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنا نام بھی ''جافر ہسن'' لکھا کرتے تھے[4]۔ اس پر تو اناللہ ہی پڑھی جا سکتی ہے۔

اَش اَش یا عَش عَش؟

اسے عام طور پر عش عش ہی لکھا جاتا ہے، یعنی عین سے، مثلاً وہ اس بات پر عش عش کر اُٹھے، یعنی بہت داد دی، واہ وا کرنے لگے، تعجب کے ساتھ تعریف کی، خوشی کے مارے وجد کرنے لگے وغیرہ۔ دراصل کچھ لوگوں نے یہ فرض کر لیا کہ عش عش کا لفظ ''عیش'' سے بنا ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں اور اس کا درست املا عین سے نہیں بلکہ الف سے ہے یعنی اسے عش عش نہیں بلکہ اش اش لکھنا چاہیے۔

فرہنگِ آصفیہ میں سید احمد دہلوی نے ''عش عش'' کو اَش اَش سے رجوع کرایا ہے اور ''اش اش'' کے تحت لکھتے ہیں: یہ لفظ عربی میں اشاش تھا جس کے معنی شادی و انبساط یعنی خوشی منانے کے ہیں۔ اردو والوں نے اسے بگاڑ کر اش اش کر لیا اور یہاں تک ہاتھ صاف کیا کہ عین سے عشعش لکھنے لگے اور اپنے ذہن میں خلافِ قاعدہ عیش اس کا ماخذ بھی قرار دے لیا حالانکہ اس ''عشعش'' کے معنی گھونسلے کے آئے ہیں[5]۔

رشید حسن خان نے بھی لکھا ہے کہ اش اش کرنا یا اش اش کر اُٹھنا کو ''ع'' سے ''عش عش'' لکھنا درست نہیں ہے، انھوں نے اس کی سند میں ناسخ کا یہ شعر بھی دیا ہے:

> ہم سفر وہ ہے جس پہ جی غش ہے
> دشتِ غربت مقامِ اش اش ہے [6]

احسان دانش نے ذوق کے کلام سے ''عش عش'' (یعنی عین سے) کی سند تو دی ہے لیکن اصل میں ان کا بھی یہی خیال ہے کہ اس کا صحیح املا عین کی بجائے الف سے یعنی ''اش اش''

درست ہے۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے ناسخ کا منقولہ بالا شعر بھی درج کیا ہے۔ البتہ ان کے خیال میں ناسخ کا اس اردو لفظ ''اش اش'' کو اضافت کے زیر کے ذریعے عربی لفظ ''مقام'' کے ساتھ بطورِ مرکب اضافی لکھنا (یعنی ''مقامِ اش اش'') درست نہیں ہے۔ اکثر اہل علم اردو الفاظ کے ساتھ عربی یا فارسی کے اس طرح کے مرکب کو ٹھیک نہیں سمجھتے ہے۔ لیکن سر دست اس بحث سے گریز کرتے ہوئے عرض ہے کہ درست املا اش اش ہے۔ اب اگر کوئی کبھی درست محاورہ لکھے تو آپ بھی اش اش کیجیے گا، لیکن الف سے۔ اگر عین سے عشعش کیا تو گھونسلا بن جائے گا۔

مہذِب یا مہذَب؟

مہذَب (ذال پرزبر، تشدید کے ساتھ) اور مہذِب (ذال کے نیچے زیر، تشدید کے ساتھ) دونوں درست ہیں مگر دونوں کے معنی مختلف ہیں۔ البتہ اب لوگ اس فرق کو سمجھے بغیر شائستہ، بااخلاق اور آداب وتہذیب کا خیال رکھنے والے کو بھی ''مہذِب'' (ذال کے نیچے زیر) کہہ دیتے ہیں حالانکہ اس کا مطلب ہے تہذیب سکھانے والا، شائستگی سکھانے والا۔ لیکن جو تہذیب سیکھا ہوا ہو، جس کی تہذیب کی گئی ہو یعنی تہذیب یافتہ ہو، آداب اور شائستگی کا خیال رکھنے والا ہو اسے ''مہذَب'' (ذال کے اوپر زبر) کہتے ہیں۔

اکبر الہٰ آبادی نے جب ان لوگوں پر طنز کیا جو مغربی تہذیب کو اپنانا مہذّب ہونے کی نشانی سمجھتے تھے تو کہا:

ہوئے اس قدر مہذّب، کبھی گھر کا منھ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں ، مرے اسپتال جا کر

مہذب اور تہذیب کا ذکر نکلا ہے تو بتاتے چلیں کہ لفظ تہذیب کی اصل بھی بہت دل چسپ ہے۔ احمد دین نے اپنی کتاب ''سرگزشتِ الفاظ'' میں لکھا ہے کہ تہذیب کے لفظی معنی ہیں کھجور کے درخت کے تنے سے چھال کا ریشہ دور کرنا۔ گویا جب انسان سے رذیل باتوں کو چھیل کر الگ کر دیا جائے تو وہ مہذّب یعنی تہذیب یافتہ ہو جاتا ہے۸۔

کہنا یہ مقصود ہے کہ جو تہذیب یافتہ ہو وہ مہذَّب (ذال کے اوپر زبر) ہے اور جو دوسروں کو تہذیب سکھائے وہ مہذِب (ذیل کے نیچے زیر) ہے۔

پسِ منظر نہیں پس منظر

فارسی سے دوری کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہم اب ان فارسی الفاظ وتراکیب سے ناآشنا ہیں جن کا استعمال ہمارے بزرگوں کے زمانے میں عام بات تھی۔ نئی نسل کے بعض افراد اسی لیے فارسی کے ان مرکبات میں ٹھوکر کھاتے ہیں جن میں اضافت آتی ہے۔ جہاں اضافت ہونی چاہیے وہاں ہمارے نوجوان طلبہ وطالبات اضافت کھا جاتے ہیں اور جہاں اضافت نہیں ہے وہاں بھی اضافت لگاتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ کچھ عرصے قبل تک اضافت کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

افتخار عارف صاحب سے کچھ عرصے قبل اس مسئلے پر بات ہو رہی تھی تو انھوں نے ایک عجیب قصہ سنایا۔ کہنے لگے کہ کوئی پچاس ساٹھ سال پہلے لکھنؤ میں ان کی ایک بزرگ رشتے دار خاتون کی بیٹی کا رشتہ آیا۔ رشتہ ہر لحاظ سے مناسب تھا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ بڑی حیرت ہوئی، جب پوچھا گیا کہ خالہ آپ نے اتنا اچھا رشتہ کیوں ٹھکرا دیا۔ تو کہنے لگیں ''اے لو، تمھیں نہیں معلوم، لڑکا اضافت کھاتا ہے۔ بھلا میں اس شخص کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے دوں جو اضافت کھاتا ہے؟''۔

''خط کتابت'' کو ''خط وکتابت'' لکھنا اس لیے غلط ہے کہ یہ دراصل ''کتابتِ خط'' کی مقلوب صورت ہے۔ کتابت کے معنی ہیں لکھنا اور کتابتِ خط کا مطلب ہوا خط لکھنا۔ جب یہ ترکیب مقلوب صورت میں یعنی اضافت کے بغیر اور پلٹی ہوئی حالت میں آئی تو ''خط کتابت'' کی ترکیب بنی

گویا ان کے خیال میں اضافت کھانا اتنا ہی بڑا عیب تھا جیسے شراب پینا یا جوا کھیلنا۔ زبان کی غلطی پر رشتہ نہ دینے والے اب کہاں ہیں؟

اب تو اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اضافت لگانے یا نہ لگانے کے معاملے میں الجھن کا شکار نظر آتے ہیں۔ اور اس افراط وتفریط کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں بھی اضافت لگائی جارہی ہے جہاں اضافت کی کوئی تک ہی نہیں بنتی۔ ایسی ہی ایک ترکیب ''پس منظر'' ہے، جس میں اضافت نہیں ہے۔ لیکن کئی لوگوں کو ''پسِ منظر'' (یعنی پس کے سین کے نیچے اضافت کے زیر کے ساتھ) بولتے سنا گیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ پس منظر میں اضافت کا زیر اس لیے نہیں ہے کہ پس کا مطلب ہے پیچھے اور ''پس منظر'' کا مطلب ہے پیچھے کا منظر، جسے انگریزی میں بیک گراؤنڈ (background) کہتے ہیں۔ لیکن اگر اس کو ''پسِ منظر''، یعنی سین کے نیچے اضافت کے زیر کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا مطلب ہوگا ''منظر کے پیچھے'' اور یہ معنی بالکل مختلف ہیں لہٰذا جملے کا مفہوم خبط ہو جائے گا۔ جیسے پسِ دیوار کا مطلب ہے دیوار کے پیچھے، پسِ پردہ کا مطلب ہے پردے کے پیچھے، پسِ آئینہ کا مطلب ہے آئینے کے پیچھے۔ سلیم کوثر کے بقول:

سرِ آئینہ مرا عکس ہے پسِ آئینہ کوئی اور ہے

اسی طرح پسِ منظر کے معنی ہوں گے منظر کے پیچھے، جو بے تکی بات ہے۔ اس میں زیر بالکل نہیں لگانا چاہیے۔ صحیح ترکیب پس منظر (یعنی بیک گراؤنڈ کے مفہوم میں) اضافت کے بغیر ہے۔

پس منظر کی فارسی ترکیب دراصل ''منظرِ پس'' کی صورت میں تھی۔ فارسی میں جب ترکیب الٹ جاتی ہے تو اس میں سے اضافت کا زیر نکل جاتا ہے۔ اسے اضافتِ مقلوب کہتے ہیں۔ مقلوب یعنی پلٹا ہوا یا اُلٹا یا ہوا۔ عبدالستار صدیقی جیسے جید عالم زباں اور ماہر لسانیات نے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ یہ طریقہ فارسی میں بہت عرصے سے رائج رہا ہے۔ اپنی کتاب ''مقالاتِ صدیقی'' میں انھوں نے مثال دی ہے کہ شہرِ ایران کو ایران شہر کہتے ہیں۔ زمینِ ایران کو ایران زمین بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح شاہِ شاہان (یعنی بادشاہوں کا بادشاہ) کی ترکیب الٹ گئی اس میں سے زیر نکل گیا اور ''شاہان شاہ'' بن گیا جسے بعد میں شاہنشاہ بھی لکھنے لگے۔ شاہ کی تخفیف شدہ صورت ''شہ'' بھی ہے اس لیے اسے شہنشاہ کہنے لگے، یعنی شاہوں کا شاہ، مراد ہے سب سے بڑا بادشاہ ۹۔

گویا پس منظر میں اضافت نہیں ہے اور اسے اضافت کے زیر کے ساتھ یعنی پسِ منظر بولنا معنی و مفہوم کو کہیں پیچھے گم کرنے کے مترادف ہے۔

''خط وکتابت'' کیوں غلط ہے؟

''خط کتابت'' کو ''خط وکتابت'' لکھنا اس لیے غلط ہے کہ یہ دراصل ''کتابتِ خط'' کی مقلوب صورت ہے۔ کتابت کے معنی ہیں لکھنا اور کتابتِ خط کا مطلب ہوا خط لکھنا۔ جب یہ ترکیب مقلوب صورت میں یعنی اضافت کے بغیر اور پلٹی ہوئی حالت میں آئی تو ''خط کتابت'' کی ترکیب بنی، یعنی خط لکھنا۔ اب بتائیے کہ ''خط وکتابت'' کیسے درست ہو سکتا ہے کیونکہ ''و'' تو ''اور'' کے معنی میں ہے اور خط وکتابت کے مفہوم ہوگا '' خط اور لکھنا''، جو بے معنی بات ہے۔ گویا خط کتابت درست ہے، خط وکتابت غلط ہے۔

پیشِ لفظ نہیں پیش لفظ

اردو میں پی ایچ ڈی کرنے والی ایک طالبہ نے

جب پیش لفظ کو ''پیشِ لفظ'' یعنی اضافت کے زیر کے ساتھ پڑھا تو کلیجہ بیٹھ گیا۔ اگر اردو میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کا یہ عالم ہے تو عام لوگوں کا مذکور کیا؟ اس ترکیب میں بھی الفاظ کی ترتیب پلٹ گئی ہے اور یہ پہلے لفظِ پیش تھا۔ پیش کا مطلب ہے آگے ۔ لفظِ پیش کا مطلب ہے جو لفظ پہلے یا آگے آئے۔ اضافت جب مقلوب ہوئی تو زیر نکل گیا، الفاظ کی ترتیب الٹی اور ترکیب بن گئی ''پیش لفظ''۔ اصل کتاب سے پہلے دیباچے یا مقدمے وغیرہ کو اسی لیے پیش لفظ کہتے ہیں کہ وہ گویا پہلا لفظ یا پہلی بات ہوتی ہے۔ پیش لفظ کو پیشِ لفظ لکھنا اور بولنا افسوس ناک ہی کہا جاسکتا ہے۔

بصدِ ادب نہیں بصد ادب

پیش لفظ کو پیشِ لفظ بولنے والی تو خیر طالبہ تھی لیکن جب اردو کے ایک پروفیسر صاحب کو ''بصدِ ادب'' بولتے سنا تو نہ پوچھیے کیسا جی جلا (اور اردو کی حالتِ زار کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی)۔ یہاں بھی اضافت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ''بہ'' یا ''بَ'' کا مطلب ہے ''سے''۔ بصد ادب یعنی سَو (۱۰۰) ادب سے، مراد یہ کہ بہت ادب سے۔

ان پروفیسر صاحب سے تو کچھ کہنا سوئے ادب ہوتا لیکن آپ سے بصد ادب درخواست ہے کہ اسے ''بصد ادب'' بولا کیجیے یعنی اضافت کے بغیر ہی یہ درست ہے۔

چشمِ زدن نہیں چشم زدن

چشم زدن کی ترکیب کی بھی ان دنوں شامت ہوئی ہے اور لوگ اسے چشمِ زدن (یعنی میم کے نیچے اضافت کے زیر کے ساتھ) پڑھنے لگے ہیں۔ ''زدن'' فارسی کا مصدر ہے، اس کے معنی ہیں مارنا۔ آتش زدگی اور آفت زدہ میں یہی ''زدن'' ہے جو شکل بدل بدل کر آرہا ہے۔ غم زدہ کا مطلب ہے غم کا مارا۔ شمشیر زن، راہ زن، نقب زنی، زدوکوب اور سر زنش میں بھی یہی ''زدن'' مختلف انداز میں جلوہ دکھا رہا ہے بلکہ خندہ زن ہے۔ چشم کا مطلب ہے آنکھ۔ تو چشم زدن کا مطلب ہوا'' آنکھ مارنا''۔ یہ ''پلک جھپکنا'' کے معنی میں بھی آتا ہے ۔ گویا'' چشم زدن میں'' کا مطلب ہوا'' پلک جھپکتے میں''، یعنی فوراً، اتنی دیر میں جتنی دیر پلک جھپکنے میں لگتی ہے، ایک لمحے میں۔ تو درست تلفظ ہوگا چشم زدن (بغیر اضافت کے)۔ اس کا استعمال یوں ہوگا کہ ''یہ واقعہ چشم زدن میں پیش آیا''، یعنی ایک لمحے میں، بہت تیزی سے۔

''میرا صاحب زادہ''، یعنی؟

کچھ لوگ اپنے بیٹے یا بیٹی کا تعارف کراتے ہیں تو ''گاڑھی اردو'' بولنے کے شوق میں کہتے ہیں کہ یہ میری صاحب زادی ہیں یا یہ میرے صاحب زادے ہیں ۔ ان کے خیال میں اس سے مخاطب پر ذرا رعب پڑتا ہے کہ انھیں بہت ثقیل اردو بھی آتی ہے۔ لیکن درحقیقت کوئی صاحب جب اپنی اولاد کو صاحب زادہ یا صاحب زادی کہتے ہیں تو گویا اپنی اردو دانی کے بارے میں شبہات پیدا کردیتے ہیں ۔ کیونکہ صاحب زادہ کا مطلب ہے صاحب کا بیٹا، صاحب کی اولاد۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ وہ حضرت خود کو صاحب کہہ رہے ہیں۔ یہ بڑی بے ہودہ بات ہے ۔ دوسرے معنی بہت برے ہیں کیونکہ صاحب کا مطلب مالک یا آقا بھی ہے۔ اپنی اولاد کو صاحب کی یا مالک کی اولاد بتانا بھی بہت بے ہودہ بات ہے۔

عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب تو لفظ ''صاحب'' کو ''انگریز'' کے معنوں میں برتتے تھے۔ ایک بار اپنے بیٹے کے ساتھ کہیں جارہے تھے تو کسی نے پوچھا ''یہ آپ کا صاحب زادہ ہے''؟ کہنے لگے ''نہیں جناب، صاحب زادہ نہیں ہے۔ میرا بیٹا ہے''۔

شاہ صاحب تو خیر اس معاملے میں بہت سخت تھے لیکن دوسروں کی اولاد کو تو '' آپ کا صاحب زادہ'' یا ''ان کی صاحب زادی'' کہا جاسکتا ہے کہ اس سے مخاطب کے لیے احترام جھلکتا ہے۔ البتہ اپنی اولاد کو صاحب زادہ کہنا گویا خود اپنا احترام کرنا ہے، واہ صاحب! کیا بات ہے!

پھولوں کا گلدستہ یعنی چہ؟

تقریبات میں جب مہمانوں کو گل دستہ پیش کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو اکثر نظامت کرنے والے اعلان کرتے ہیں کہ مہمان کو'' پھولوں کا گل دستہ'' پیش کیا جائے گا۔ حالانکہ گل دستہ کہنا کافی ہے کیونکہ گل کا مطلب پھول ہی ہے ۔ گل دستہ اگر پھولوں کا نہیں ہوگا تو کیا پتھروں کا ہوگا؟ لیکن اب تو ٹی وی پر بھی کسی محفل کا حال بیان کرتے ہوئے یا ہوائی اڈے پر غیر ملکی مہمانوں کے استقبال کی خبر نشر کرتے ہوئے خبریں پڑھنے والے بڑی سنجیدگی سے ''پھولوں کا گل دستہ'' پیش کیے جانے کا اعلان کرتے ہیں، لیکن اسے سن کر ہمیں ہنسی آجاتی ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے بعض لوگ '' آبِ زم زم کا پانی'' کہتے ہیں حالانکہ آب کا مطلب پانی ہی ہے۔ یا تو آبِ زم زم کہنا چاہیے یا زم زم کا پانی۔ اسی طرح ''سنگِ مرمر کا پتھر'' بھی سنا گیا ہے لیکن اس میں بھی ایک لفظ اضافی ہے۔ لفظ سنگ کا مطلب پتھر ہے لہٰذا سنگِ مرمر کہنا کافی ہے۔ یا پھر مرمر کا پتھر کہہ سکتے ہیں۔ ایسی ایک اور غلطی جو عام ہے وہ ''فصلِ بہار کا موسم'' ہے۔ اس ترکیب میں ''فصل'' کا مطلب موسم ہی ہے (فصل کے اور معنی بھی ہیں)۔ گویا فصلِ بہار کہنا کافی ہے یا موسمِ بہار کہیے۔ بہار کا موسم بھی کہہ سکتے ہیں۔

پھولوں کا گل دستہ بولنا یا لکھنا تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے ''سونے کا طلائی تمغا'' یا ''لبِ دریا کے کنارے''۔ ظاہر ہے کہ طلائی کا مطلب ہی ہے سونے کا۔ دوسری ترکیب میں ''لب'' کا لفظ کنارے ہی کے معنی میں آیا ہے۔ گویا صرف ''گل دستہ'' کہنا کافی ہے۔ ''پھولوں کا گل دستہ'' مضحکہ خیز بات ہے۔

استفادہ حاصل کرنا؟

بعض لوگوں کو بولتے سنا ہے ''میں نے استفادہ حاصل کیا'' بلکہ اس طرح کہیں لکھا ہوا بھی نظر سے گزرا ہے۔ لفظ ''استفادہ'' کے معنی ہیں فائدہ اٹھانا، نفع حاصل کرنا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ استفادہ کے لفظ میں حاصل کرنے کا مفہوم موجود ہے، اس لیے ''استفادہ حاصل کیا'' نہیں بولنا چاہیے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ ''میں نے استفادہ کیا''۔

مکتبِ فکر یا مکتبۂ فکر؟

پچھلے دنوں ایک کہنہ مشق لکھاری کے کالم میں ''مکتبۂ فکر'' کی ترکیب نظر سے گزری۔ بہت تعجب ہوا کہ اتنے پڑھے لکھے اور تجربے کار محقق اور ادیب نے مکتب اور مکتبہ کے فرق پر غور نہیں کیا۔ ان دونوں لفظوں کے معنی میں بہت فرق ہے اور اسی لیے مکتبۂ فکر کی ترکیب درست نہیں ہے۔

''مکتبہ'' عربی میں کتب خانے یا لائبریری کو کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بعض کتب فروش اور ناشر یعنی پبلشر بھی اپنے کاروبار یا دکان کے نام میں مکتبہ کا لفظ لکھتے ہیں، مثلاً مکتبۂ فلاں۔ گویا مکتبہ کے ایک اور معنی اب اردو میں ہیں: ناشر یا تاجرِ کتب کا کام یعنی طباعت و اشاعت و تجارتِ کتب، نیز کتابوں کی اشاعت یا تجارت کے ادارے (کمپنی یا دکان) کو بھی اب اردو میں مکتبہ کہنے لگے ہیں۔ جبکہ عربی لفظ ''مکتب'' کے لغوی معنی ہیں وہ جگہ جہاں لکھنا سکھایا جاتا ہے، مراد یہ کہ جہاں تعلیم دی جاتی ہے۔ اسے درس دینے کی جگہ یعنی مدرسہ اور آج کی زبان میں اسکول (school) کہہ لیجیے۔ مکتبِ فکر کا مطلب ہے کسی خاص نظریے یا نظریات کا مجموعہ، نیز کوئی خاص فلسفہ یا فکر یا اس کے ماننے والے۔ شعروادب یا مصوری کے کسی خاص انداز یا اسلوب کو بھی اسکول یا مکتبِ فکر کہتے ہیں

اوراسے اردو میں دبستان بھی کہا جاتا ہے، جیسے دبستانِ لکھنؤ یا دبستانِ دہلی (دبستان فارسی کا لفظ ہے اوراس کے معنی اسکول یا مدرسے ہی کے ہیں)۔ گویا مکتبِ فکر یا دبستان ِ فکر وہ ہے جسے انگریزی میں ''اسکول اوف تھاٹ'' (school of thought) کہا جاتا ہے۔اردو میں اسے دبستانِ فکر بھی کہتے ہیں۔شان الحق حقی نے اپنی انگریزی بہ اردو لغت میں (school of thought) کے معنی ''مدرسۂ فکر'' درج کیے ہیں۔

عنایت علی خاں صاحب کے ایک شعر میں مکتبِ فکر کی ترکیب استعمال ہوئی ہے:

مکتبِ فکر ہے ،اسکول نہیں ہے صاحب
قومیانے کی اجازت نہیں دی جائے گی

گویا درست ترکیب ''مکتبِ فکر'' ہے۔

مکاتِب یا مکاتیب؟

مکاتب اور مکاتیب دو الگ الگ لفظ ہیں لیکن ان دونوں الفاظ کے استعمال میں یا ان کے املا میں احتیاط نہیں کی جاتی جس سے معنی بدل جاتے ہیں۔

مکتب (یعنی اسکول) کی جمع ہے مکاتب ۔گویا مکتبِ فکر کی جمع ہوگی مکاتبِ فکر۔جبکہ مکاتیب جمع ہے مکتوب کی۔مکتوب کے لفظی معنی ہیں لکھا ہوا۔ خط کو بھی مکتوب کہتے ہیں۔ مکاتیب کے معنی ہوئے خطوط، جیسے مکاتیبِ شبلی یعنی شبلی کے خطوط، مکاتیب ِ مشاہیر یعنی مشہور لوگوں کے خطوط۔مکتوب کی جمع مکاتیب بھی ہے اور مکتوبات بھی۔ گویا مکتوباتِ غالب اور مکاتیبِ غالب کا ایک ہی مفہوم ہوگا یعنی خطوطِ غالب۔

اردو میں مکتبِ فکر کی جمع بناتے ہوئے بھی بسا اوقات احتیاط نہیں کی جاتی اوراسے مکاتیبِ فکر لکھا جاتا ہے۔ مکتب کی جمع مکاتِب ہے، گویا ''مکاتبِ فکر'' کے ہجے میں ''ی'' لکھنا غلط ہے۔ درست ترکیب ''ی'' کے بغیر ہے یعنی مکاتبِ فکر اور واحد ہے مکتبِ فکر۔

ہاں البتہ مکتوب کی جمع (یعنی خطوط) مکاتیب ہے، جیسے علامہ اقبال کے خطوط کے ایک مجموعے کا عنوان ''کلیاتِ مکاتیبِ اقبال'' ہے۔

ناتا یا ناطہ؟

ناتا عربی کا لفظ ہرگز نہیں ہے۔ اور طوے (ط) عربی الفاظ ہی میں آسکتی ہے۔ ناتا خالصتاً مقامی لفظ ہے۔ اسے آپ دیسی لفظ یا ہندی یا اردو کا لفظ کہہ لیجیے۔لہٰذا اس کے املا میں ''ط'' کا کوئی کام نہیں۔اس کا درست املا ''ناتا'' ہے۔ اس کے مرکبات مثلاً رشتہ ناتا، ناتا جوڑنا، ناتا توڑنا وغیرہ میں بھی ''ت'' ہی لکھنا صحیح ہے۔

تابع یا تابع دار؟

تابع کا مطلب ہے جو اتباع کرے۔اتباع کے معنی ہیں فرماں برداری، اطاعت، پیروی۔ گویا تابع اسم فاعل ہے اور اس کے معنی ہیں جو اطاعت کرتا ہو، جو حکم مانے، فرماں بردار، مطیع۔اردو میں ملازم کے معنی میں بھی آتا ہے۔لہٰذا اس میں دار لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ''دار'' فارسی کے مصدر ''داشتن'' سے ہے جس کے معنی ہیں رکھنا اور دار کا مطلب ہے رکھنے والا۔ دار کا لاحقہ وہاں لگایا جاتا ہے جہاں پہلے ایک اسم آرہا ہو، جیسے سمجھ دار، پہرے دار، پہلودار، ہوادار، دل دار، وضع دار، ذمے دار، چوکی دار وغیرہ۔لیکن تابع اسم فاعل ہے اور اس میں ''رکھنے والا'' کا مفہوم موجود ہے۔اس لیے تابع کے بعد ''دار'' لکھنا غیر ضروری ہے بلکہ اس سے مفہوم کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے۔اس لیے تابع دار نہیں کہنا چاہیے۔تابع کہنا کافی ہے۔مثال کے طور پر: ہم آپ کے تابع ہیں، میں آپ کا تابع ہوں، وغیرہ۔

حواشی

۱۔ رشید حسن خاں، اردو املا، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء، ص۱۵۶ [دوسرا ایڈیشن]۔

۲۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: عبدالستار صدیقی کا مقالہ ذال معجمہ فارسی میں، مشمولہ مقالاتِ عبدالستار صدیقی، جلد اول، مرتبہ مسلم صدیقی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۷ء، ص۹۸_۸۰

۳۔ دیکھیے: سید قدرت نقوی کا مقالہ غالب اور ذال معجم، مشمولہ غالب صدرنگ، کراچی: ادارۂ یادگارِ غالب، ۲۰۰۲ء، ص ۲۷۲_۲۳۸

۴۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: مالک رام، تذکرۂ معاصرین، ترتیب نو کے ساتھ (ہر چہار جلد یک جا)، راول پنڈی: الفتح پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص۳۱۸_۳۱۳

۵۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ مبنی بر چہار جلد، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۷۷ء۔

۶۔ رشید حسن خاں، محولہ بالا، ص۷۰۔

۷۔ احسان دانش، لغات الاصلاح، لاہور: مکتبۂ دانش، ۱۹۵۲ء، ص۸۱_۸۰

۸۔ احمد دین، سرگزشتِ الفاظ، اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۰۸ء۔

۹۔ مقالاتِ صدیقی، محولہ بالا، ص۱۴۲۔